قطعہ

شاعر کا دل

19-9-19

جوش ملیح آبادی

تنقیدی جائزہ –

یہ قطعہ اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کا لکھا ہوا ہے۔ جوش کو شاعر انقلاب، شاعر شباب اور شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔ جوش نے کچھ غزلیں بھی لکھیں ہیں لیکن اصل میں یہ نظم کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ۹۵ فیصد حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ جوش نے اپنی انقلابی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں گرمی پیدا کی۔

ان کی نظمیں جنگ آزادی کے مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ جوش نے فطرت پر بھی بڑی خوبصورت نظمیں لکھیں ہیں۔ جوش ۱۸۹۸ء میں اتر پردیش کے ایک گاؤں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان آزاد ہونے کے کچھ برس بعد وہ پاکستان منتقل ہوئے اور وہیں ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

نظم شاعر کا دل ایک ہلکی پھلکی نظم ہے جو قطعہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اس قطعہ میں جوش نے دل کے بارے میں بڑے دلچسپ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ مختلف موقعوں پر دل کی جو حالت اور کیفیت ہوتی ہے اسے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر اس نظم کا مرکزی خیال شاعر کا دل ہے

جوش نے کہا ہے کہ کبھی دل بڑے فخر و غرور سے یہ کہتا ہے کہ آسمان کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ایک تنکے سے بھی ہلکا ہے کبھی یہ کہتا ہے کہ میں اتنا نازک ہوں کہ مجھے سانس لینا بھی کوہ گراں معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سانس لینا بھی ایک بڑے پہاڑ کی طرح بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ کبھی میں خاک کے ایک معمولی ذرے کا غلام ہو جاتا ہوں۔ تو کبھی شمس و قمر پر حکمرانی کرتا ہے مطلب کہنے کا یہ ہے کہ کبھی معمولی باتوں سے رنجیدہ ہو جاتا ہوں اور کبھی بڑے بڑے مسائل و مصائب کا ہنستے ہوئے مقابلہ کرتا ہوں۔

کبھی تو میں کامران (کامیاب) ہو کر بھی خود کو ناکام سمجھتا ہوں اور کبھی ناکامی میں کامیابی تلاش کرتا ہوں۔ کبھی کبھی خدا کی بے پناہ مہربانی اور اس کے لطف و عنایت سے ~~مغفو~~ محروم ہو جاتا ہے ہوں اور کبھی اہل محبوب کے ظلم و ستم پر خوش ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کی ایک ترچھی نظر اور ناقدری کی وجہ سے کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہوں۔ اور کبھی بڑے بڑے مصائب، دکھ درد اور مشکلات کا جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہوں۔

آخر میں جوش نے یہ کہا ہے کہ وہ دل جس کی یہ حالت اور کیفیت ہوتی رہتی ہے وہ شاعر کا دل ہے۔ یعنی شاعر کبھی تو معمولی معمولی غم سے بدحواس ہو جاتا ہے اور کبھی بڑی بڑی مشکلات کا سامنا جواں مردی کے ساتھ کرتا ہے۔

Scanned by CamScanner

یہی وہ دل ہے جو شاعر کو سماجی و سیاسی انقلاب لانے کے لیے تیار کرتا ہے۔ کبھی مغموم رہتا ہے تو کبھی خوش و شادماں۔ دنیا کے تمام اہل حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ شاعر کا دل نہایت ہی حساس ہوتا ہے۔

آخری شعر میں جوش نے یہ کہا ہے شاعر کے دل کی حقیقت کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے دل کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو دل کا راز داں ہے جس کی نظر گہری ہے اور جس نے شاعر کی فطرت اور ان کے مزاج کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔

یقیناً شاعر کا دل اور دماغ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔

ملا اور بہشت

۲۵-۹-۱۹

علامہ اقبال

"ملا اور بہشت" چار اشعار پر مشتمل علامہ اقبال کا مختصر قطعہ ہے۔ اس قطعہ میں اقبال نے "ملا" کی نفسیات اور اس کے کردار کو طنزیہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ قدیم زمانے میں یا اسلام کے دورِ اول اور وسطیٰ میں لفظ ملا کے معنی بہت بڑے مذہبی عالم اور فاضل کے ہوا کرتے تھے۔ آج بڑے عالم فاضل کو ہم علامہ کہتے ہیں لیکن پہلے ملا کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ بڑے بڑے علماء کے ساتھ کم درجے کے عالموں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگ جب چھوٹے موٹے مذہبی عالم کو ملا کہنے لگے تو اس لفظ کی عظمت اور اہمیت ختم ہو گئی۔ آج کے زمانے میں ہر چھوٹے مذہبی عالم کو ملا کہا جاتا ہے۔ مکتب میں بچوں کو عربی پڑھانے والے کو بھی ملا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مؤذن جی کو بھی ملا کہا جاتا ہے۔

اعلیٰ درجے کا مذہبی عالم فاضل جو ہوتا ہے اس میں سنجیدگی، بردباری، انکساری اور شرافت ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے ہر پڑھے لکھے شخص اور عالم میں سنجیدگی، متانت، گہری نظر اور صبر و ضبط ہوتا ہے۔ اس کے اخلاق بلند اور مزاج میں شائستگی ہوتی ہے۔ لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہمارے دور کے علماء میں بڑی سختی اور شدت ہوتی ہے۔ وہ بڑے جھگڑالو مزاج ہوتے ہیں۔

جو حقیقی عالم ہوتا ہے جسے دین کی سمجھ ہوتی ہے اس
میں سنجیدگی اور شائستگی ضرور ہوتی ہے لیکن ایسے علماء
ہمارے معاشرے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ
علماء کے نام پر ایسے لوگوں کا گروہ موجود ہے جو بات بات
پر مسلمانوں ہی کو مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں۔ ہر
معاملے میں سختی اور شدت سے پیش آتے ہیں۔ غور و فکر
کر کے مسائل کا بہترین حل نکالنے کے بجائے جھگڑے
پیدا کرنا ان کا کام ہوتا ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کو راہِ راست
بتانا اور دوسرے تمام فرقوں کو دوزخی قرار دینا ان کا
روزمرہ کا معمول ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات کو لے کر
وہ جھگڑے پیدا کرتے ہیں۔ اور نئے نئے فرقے پیدا ہونے کا
سبب بھی بنتے ہیں۔

اسلام تربیت، شائستگی اور سنجیدگی اور
بلند اخلاق کی تعلیم دیتا ہے لیکن آج کل کے ملا کا کردار
اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے کردار اور عمل سے
معاشرے میں جھگڑے پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اسی
لیے اقبال نے ایسے مذہبی ملاؤں کو سخت ناپسند کیا ہے۔
اس قطعہ میں اقبال نے اسی ناراضگی اور ناپسندگی کو ظاہر
کیا ہے۔

اس قطعہ میں اقبال نے یہ کہا ہے کہ جس
وقت اللہ کی طرف سے ملا کو بہشت میں جانے کا حکم
ملا تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ اللہ کے اس حکم پر مجھ سے رہا نہ
ہو سکا اور میں نے اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ

"یا الٰہی! میں تیرے فیصلے میں دخل اندازی کر رہا ہوں میری
گستاخی کو معاف کر۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملا کو جنت
کی حور، سکون اور پُرامن فضا راس نہیں آئے گی
جنت تو وہ مقام ہے جہاں نہ کوئی جھگڑا ہوتا ہے نہ کوئی فساد اور
نہ کسی قسم کی بحث و تکرار ہوتی ہے۔ جنت میں ہر طرف
امن و سکون کا ماحول رہتا ہے۔ ملا کی فطرت میں بحث
و تکرار اور بات بات پر جھگڑے کرنا ہے۔ یہ بندہ جنت
میں فساد برپا کر کے جنت کا امن و سکون غارت کر دے گا
کیونکہ جھگڑا و فساد کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے یہ
اپنی غرض کی خاطر اور اپنے فائدے کے لیے عوام اور علماء کو گمراہ
کرتا ہے اس لیے یہ کسی صورت میں جنت کا حقدار نہیں ہے۔

یہ وہ شخص ہوتا ہے جو مسجد میں بھی لڑتے جھگڑتے رہتا ہے
اس میں صبر و ضبط اور سنجیدگی اور شائستگی و انکساری نام
کو نہیں۔ لہٰذا اس کا صحیح مقام جنت نہیں بلکہ جہنم ہے
اس قطعے میں اقبال نے تیکھے مذہبی عالموں اور ان کے کردار
و عمل پر سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ اور اشارے و کنائے
میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ سچے عالم دین ایسا نہیں ہوتا

Scanned by CamScanner

فرضی لطیفہ

اردو کے مشہور طنز و مزاح کے شاعر اکبر الہ آبادی کا لکھا ہوا لطیفہ ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی طنز و ظرافت والی شاعری سے ہندوستانی قوم بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی اخلاقی، ذہنی اور سماجی اصلاح کا کام کیا۔ نصاب میں شامل یہ قطعہ بھی نوجوانوں کی تعلیمی اصلاح کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ اکبر نے نوجوانوں کی اصلاح کے لیے ایک فرضی لطیفہ کو نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اکبر کے زمانے میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت پست تھی۔ بلکہ غیر مسلموں کی تعلیمی حالت اونچی تھی۔ آج بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑی لاپرواہی سے کام لیتے ہیں۔

یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ تعلیم ہی کسی قوم کی ترقی کا بنیادی سبب ہوتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز کرنے والے نوجوان اس دور میں بھی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے تھے اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔ اکبر نے مسلمانوں کی سوچ اور تعلیم و تربیت کے تعلق سے ان کی غفلت سے بہت رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے ان کی ترقی اور خوشحالی کے دن آئیں گے یا نہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ان کے روشن مستقبل سے مایوس ہو چکا ہوں۔ ہماری قوم کے لوگ کسی چیز کو حاصل کرنے کی آرزو تو دل میں رکھتے

ہیں لیکن اس سلسلے میں جتنی کوشش اور محنت کرنی چاہیے وہ نہیں کرتے۔ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے کام لیتے ہیں۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے اکبر نے ایک فرضی لطیفہ پیش کیا ہے۔

اکبر نے یہ کہا ہے کہ نوجوان عاشق سے ایک نوجوان کسی کے عشق میں گرفتار تھا اور وہ اس سے شادی کر لینے کا خواہش مند تھا۔ اس لڑکی کی والدہ یہ شرط رکھتی ہے کہ بیٹا اگر تم M.A پاس کر لے تو میں فوراً اپنی بیٹی سے تیرا بیاہ کرا دوں گی۔ یہ سن کر وہ مجنوں یہ کہتا ہے کہ اے بڑی بی تم نے یہ کیسی عجیب و غریب شرط رکھی ہے کہاں میں عاشق اور کہاں یہ کالج کی بکواس؟ مجھے پڑھنے لکھنے سے کیا کام۔ مجھے تعلیم سے سخت نفرت ہوتی ہے یہ بات میری فطرت کے خلاف ہے اے بڑی بی یہ تو بتاؤ کہ کہیں ہرن جیسے نازک جانور پر گھاس لادی جاتی ہے؟ تم میرے سامنے M.A پاس کر لینے کی شرط رکھ کر میرے ساتھ ایسا ہی کر رہی ہو۔ وہ مجنوں یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ میں ہرن کی طرح نازک، خوبصورت اور پیارا جانور ہوں تم اس پر تعلیم کی گھاس لاد کر مجھ سے گدھے کا کام لینا چاہتی ہو۔ میں ہر مشکل سے مشکل کام کرنے کے لیے تیار ہوں میں اپنے دل کا خون کرنے کو تیار ہوں، اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لیے

Scanned by CamScanner

سر کھپانے اور دماغ پگھلانے کا کام مجھ سے ہرگز نہیں ہو گا۔
آخر میں وہ یہ کہتا ہوں ہے کہ اگر تمھاری بیٹی سے شادی
کی یہی شرط ہے تو میں افسوس کے ساتھ تمھاری خدمت
میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں یعنی مجھے اس کڑی
اور سخت شرط پر تمھاری بیٹی سے شادی نہیں کرنی۔